امام حسن بصریؒ اور ان کی تفسیری خدمات

جمشید احمد ندوی

(عام طور سے سید التابعین حضرت حسن بصریؒ (۲۱ھ۔۱۱۰ھ / ۶۴۲ء۔۷۲۸ء) کی عظمت و شہرت کا مدار زہد و تصوف کے میدان میں ان کے مقام و مرتبہ کو سمجھا جاتا ہے، خالص علمی میدان میں ان کی خدمات کا شعور و اعتراف کم ہی پایا جاتا ہے حالانکہ فکر اسلامی کے ارتقاء اور اسلامی علوم کی ترویج و ترقی میں انہوں نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور ایک خاص مدرسہ فکر و نظر کے بانی ہیں۔ علم تفسیر میں بالخصوص ان کی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی احساس کے زیر اثر جناب احمد اسماعیل البسیط نے ان کی تفسیری روایات کی تحقیق و تنقیح کا بیڑہ اٹھایا اور بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے وسیع تفسیری سرمائے میں بکھرے ہوئے ان کے تفسیری آثار کی جمع و ترتیب کا فریضہ نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ ان کی اس کاوش کو مولانا عبدالقیوم صاحب نے اردو قالب عطا کیا اور اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ زیر نظر مضمون بنیادی طور پر اسی کتاب سے مستفاد ہے۔)

امام حسن بصری (۲۱ھ۔۱۱۰ھ) کا شمار ان اساطین اسلام میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلامی معاشرہ کے علاوہ اسلامی علوم و فنون پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، ان کا زمانہ اسلامی تہذیب کے عروج اور فتوحات کی کثرت کا زمانہ ہے۔ ممالک مفتوحہ میں اسلام کی اشاعت کی وجہ سے زندگی کے نئے نئے مسائل ابھر رہے تھے جن کے حل کے لئے علماء نے بڑے پیمانے پر تحقیق و اجتہاد کا سہارا لیا۔ زندگی کے ان نت نئے مسائل کو حل کرنے میں جو علماء پیش پیش رہے ان میں امام حسن بصری کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے جنہیں اس عہد کی سب سے

بھاری بھرکم شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے۔

امام حسن بصری کا زمانہ اسلام کی روز افزوں ترقی کے باوجود سخت سیاسی انتشار کا زمانہ ہے۔ جہاں ایک طرف اسلام کے پھریرے چہار سو لہرانے لگے تھے وہیں وہ خود خانہ جنگی کا شکار ہونے لگا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اسلام شاید ہی اس صورتحال سے عہدہ برآ ہو سکے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ مختلف فرقوں جیسے خوارج، شیعہ اور معتزلہ وغیرہ کے ظہور نے حالات کو مزید بگاڑ دیا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات سے قطع نظر اسکا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ علمی تحریک کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور اسلامی علوم و فنون نے خوب ترقی کی۔

حالات زندگی: حسن بصری کا تعلق طبقہ موالی سے تھا، ان کی والدہ حضرت خیرہ ام المومنین حضرت سلمہؓ کی باندی تھیں، جبکہ ان کے والد حضرت یسار پہلے نصرانی تھے اور بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت حسن بصری کی فصاحت و بلاغت نیز حکمت و دانائی کا سبب یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ بسا اوقات حضرت ام سلمہؓ انہیں اپنا دودھ پلا دیا کرتی تھیں، ان کی نشو نما وادی القریٰ میں ہوئی، حضرت عثمان کے زمانہ میں چودہ برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا اور متعدد صحابہ سے کسب فیض کیا تھا جن کی تعداد ایک روایت کے مطابق ۱۲۰ اور دوسری روایت کے مطابق ۳۰۰ ہے (ص ۸۰ و ۱۱۱)۔

حسن بصری نے ۹۰ سال کی طویل عمر پائی جو انھوں نے ساری کی ساری اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور معاشرہ کی اصلاح کرتے ہوئے گزار دی، انہوں نے زندگی کا ابتدائی حصہ یعنی ۳۷ھ تک مدینہ میں گزارا اور پھر بصرہ منتقل ہو گئے، اور وہیں کے ہو کر رہ گئے چنانچہ باوجود مدنی ہونے کے بصری ان کے نام کا ایک جزء لازم بن گیا۔ ان کی شخصیت نے بصرہ کو ایک علمی مرکز بنانے میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

انکی بصرہ کی زندگی کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۳۷ھ تا ۴۳ھ کے عرصہ پر محیط ہے جسے ان کی تعلیم و تربیت کا دور قرار دیا جاسکتا ہے اس دور میں وہ بصرہ آنے والے صحابہ کرام سے کسب فیض کر کے اپنے جیب و دامن کو گوہر مراد سے بھرتے رہے۔ دوسرا دور ۴۳ھ سے ۱۱۰ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ استقرار کا یہ مرحلہ ۶۷ برسوں پر محیط ہے۔ اس مرحلے کی ابتدا کے وقت ان کی عمر ۳۲ سال تھی۔ یہی عمر عقلی اور فکری پختگی کی عمر ہوتی ہے۔ یہی دور ان کی شخصیت کا سب سے تابناک دور ہے۔ اسی دور میں انہوں نے اپنے مدرسہ تصوف کی بنیاد

رکھی، علماء کرام کے ساتھ مباحثہ اور مجادلہ بھی جاری رہا، نیز تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ان دونوں ادوار کے درمیانی دس سال کا عرصہ (۴۳ھ تا ۵۳ھ) وہ بصرہ سے باہر غزوات و جہاد میں مصروف رہے۔ اس دوران بھی بصرہ سے ان کا رابطہ مسلسل برقرار رہا۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ انہیں متعدد صحابہ سے دوران سفر کسب فیض کا موقعہ ملا۔ (ص ۸۴، ۸۶ اور ۱۱۵)

بصرہ کے قیام کے دوران ان کا سب سے بڑا کارنامہ زہد و تقوی کے اس مدرسہ کی تاسیس کو قرار دیا جاسکتا ہے جس سے علم کلام کی ابتدا ہوئی اور جسکے ہمہ گیر اثرات اسلامی معاشرہ پر مرتب ہوئے، اس کی تاسیس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس پر تعیش اور مسرفانہ زندگی کا مقابلہ کیا جاسکے جس نے پوری مملکت اسلامی خصوصا بصرہ پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے پند و نصائح اور وعظ و تلقین کا طریقہ اختیار کیا (ص ۸۷) چنانچہ ان کی علمی خدمات سے قطع نظر ان کا شمار ان کبار واعظین اسلام میں ہوتا ہے جن کی زندگی کا نصب العین اصلاح معاشرہ تھا۔

ان مواعظ و نصائح کو بنیادی طور پر دو مقاصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ سلف کے طرز زندگی اور انداز معاشرت کے احیاء کے لئے کوشش کی جائے اور اس کی دعوت کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ پر تعیش زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے زہد و تقوی کو اختیار کیا جائے۔

انہوں نے اپنے مواعظ و نصائح میں علم و حکمت کے وہ موتی بکھیر دیئے ہیں جو آج بھی اور آئندہ بھی بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری و مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان کے مدرسہ زہد و تقوی کو تیسری صدی میں پروان چڑھنے والے تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے اگرچہ وہ بھی ان کے مدرسہ سے کسی حد تک متاثر ضرور تھا۔ ان کے نزدیک معیار و مطلوب یہ تھا کہ دنیاوی معاملات میں ایک حد تک حصہ لیتے ہوئے زہد و تقوی کی زندگی گذاری جائے جبکہ مروجہ تصوف کی اصل روح یہ ہے کہ دنیا سے منہ موڑ کر تجرد کی زندگی گزار دی جائے۔ چنانچہ ان کے مدرسے کو صرف زہد و تقوی کا مرکز قرار دینا حقیقت کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

اساتذہ:۔ خیر القرون کے متعدد صحابہ کرام اور تابعین عظام ان کے اساتذہ میں شامل ہیں

جن کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ان کے علاوہ بھی وہ متعدد صحابہ کرام کی زیارت سے مشرف ہوئے لیکن ان سے کسب فیض نہ کرسکے۔ان کے اساتذہ میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ثوبانؓ وغیرہ جیسے صحابہ کرام ہیں۔ تابعین عظام میں ان کے شیوخ میں وہی لوگ شامل ہیں جو ان سے عمر میں بڑے تھے۔اور اسی وجہ سے ان کی تعداد خاصی کم ہے ان میں حمید طویل، یزید بن ابی مریم، ایوب سختیانی، قتادہ، بکر بن عبداللہ مزنی، عوف بن اعرابی، صلہ بن اشیم، عباس بن عبدالقیس تیمی، ابراہم تستری اور معاویہ بن عبدالکریم وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے بعض ایسے اساتذہ کا بھی پتہ چلتا ہے جنسے انہوں نے کوئی خاص فن حاصل کیا تھا جیسے حطان رقاشی سے انہوں نے قرأت سیکھی تھی، اسود بن سریع تمیمی سے قصص وواقعات اخذ کرتے تھے اور ان سے اپنے مواعظ ونصائح میں فائدہ اٹھاتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر کا علم حاصل کیا لیکن وہ سب زیادہ متاثر حضرت ابوموسیٰ اشعری کے شاگرد عامر بن عبدالقیس سے تھے جو بصرہ میں زہد و تقویٰ کے پہلے مدرسہ کے موسس وبانی ہیں اور جن کی ذات گوناگوں صفات کی حامل تھی، ان کا مدرسہ زہد و تقویٰ ہی آگے چل کر حسن بصری کے مدرسہ زہد و تقویٰ کی خشت اول بن گیا، جس کے گہرے اثرات اسلامی معاشرہ پر مرتب ہوئے ہیں۔

تلامذہ:۔حسن بصری نے درسگاہ نبوی کے تربیت یافتہ اصحاب کمال کی نگرانی میں اپنا علمی سفر مکمل کیا تھا اور ان سے کسب فیض کر کے دور تابعین میں سب سے اونچے علمی مقام پر فائز ہوئے تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی تھی اور وہ تشنگان علم وفن کو ایک طویل عرصہ تک سیراب کرتے رہے جن کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔وہ ایک مستقل مدرسے کے بانی تھے جس سے مختلف مذاہب و مسالک کے چشمے پھوٹے اور جس کے اثرات تیسری صدی تک برابر محسوس کئے جاتے رہے۔مزید برآں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تیسری صدی ہجری میں ظاہر ہونے والا طریقہ تصوف بھی کسی حد تک اس مدرسے کی تعلیمات کا مرہون منت ہے۔

ان گوناگوں اثرات کے علاوہ شخصیات میں فرقہ معتزلہ کے سردار واصل بن عطاء، عمرو

بن عبید (م ۱۴۴ھ)، آزادی فکر کے علمبردار معبد جہنی (م ۸۰ھ) اور غیلان دمشقی (م بعد ۱۰۵ھ) اسی دور سے کے تربیت یافتہ تھے۔ حافظ الحدیث اور مفسر قرآن حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی (م ۱۱۷ھ)، فقیہ و محدث داؤد بن ابی ہند (م ۱۳۹ھ) اسی مدرسہ کے پروردہ تھے، ایک روایت کے مطابق حسن بصری سے مروی تفسیری روایات کی حفاظت کا سہرا حضرت قتادہ ہی کے سر جاتا ہے (۱۲۵) جبکہ ابن خلکان کے بقول شیخ المعتزلہ عمرو بن عبید نے ان سے روایت کر کے ایک تفسیر مرتب کی تھی (۱)

حافظ ابن سعد و ابن حجر نے ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست بیان کی ہے جن میں ان کے اساتذہ حمید طویل، قتادہ اور ایوب سختیانی (م ۱۳۱ھ) کے علاوہ بکر بن عبداللہ مزنی (م ۱۰۸ھ) جریر بن حازم ازدی بصری (م ۱۶۸ھ) ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ) معبد بن ایاس (م ۱۴۴ھ) سماک بن حرب (م ۱۲۳ھ) قرۃ بن خالد سدوسی (م ۱۵۴ھ) یزید بن ابراہیم تستری (م ۱۶۲ھ) حفص بن سلیمان، مطر وراق اور علی بن زید بصری (م ۱۲۹ھ) وغیرہ جیسے اساطین شامل ہیں۔

مدرسہ زہد و تقویٰ سے تعلق رکھنے والے مشہور شاگردوں میں فرقد سنجی، حبیب عجمی، مالک بن دینار (م ۱۲۷ھ) ثابت بنانی (م ۱۲۳ھ) محمد بن واسع ازدی (م ۱۲۳ھ) ایوب سختیانی (م ۱۳۱ھ) عبدالواحد بن زید (م ۱۷۷ھ) وغیرہ جیسے شیوخ تصوف شامل ہیں۔

علم حدیث میں ان سے استفادہ کرنے والوں میں مذکورہ افراد کے علاوہ جعفر بن حبان (م ۱۶۵ھ) سعد بن ابراہیم (م ۱۲۰ھ) مالک بن دینار (م ۱۲۷ھ) خالد بن مہران حذاء بصری (م ۱۴۰ھ) مرۃ بن خالد سدوسی (م ۱۵۴ھ) (۲) اور شیبان بن عبدالرحمٰن نحوی (م ۱۶۴ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

تصانیف: حسن بصری کا عہد تدوین کا عہد ہے، تصنیفی مزاج و مذاق عام نہیں ہوا تھا تاہم تدوین کا کام شروع ہو جانے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے رسائل لکھے جانے لگے تھے۔ حسن بصری نے بھی تفسیر کے علاوہ متعدد مختصر رسالے لکھے تھے لیکن بقول ان کے صاحبزادے عبداللہ بن حسن انہوں نے مرض وفات میں ایک کے سوا سارے رسالے جلوا دیے۔ (ص ۱۱۳) ابن ندیم اور فواد سیزگین کے بقول انہوں نے تفسیر کے علاوہ نزول قرآن اور العدد فی

القرآن نامی رسالے بھی لکھتے تھے۔ مصادر میں بعض دوسرے رسائل کا بھی ذکر ملتا ہے۔ زیور طبع سے آراستہ ہونے والے ان کے واحد رسالہ "فضائل مکہ" کے محقق ڈاکٹر سامی کے مطابق انہوں نے فرائض الدین ،رسالہ فی التکالیف (جو بقول ڈاکٹر سامی فرائض الدین ہی کا کوئی نسخہ ہے)شروط الامامة ، وصیة النبی لابی هریرة ، الاستغفارات المنقذة من النار اور الاحادیث المتفرقة نامی رسائل ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ موخر الذکر رسالہ میں دسویں صدی کے کسی نامعلوم مصنف نے ان کی مرویات جمع کر دی ہیں،اسکے علاوہ جاحظ نے البیان و التبیین میں "الاسماء الادریسیة" نامی ان کے خطبے کا ذکر کیا ہے بعض دوسرے محققین اخلاص کے موضوع پر ایک رسالہ اور عبدالملک کی تردید میں ایک رسالہ کو ان کی جانب منسوب کرتے ہیں ، موخر الذکر کے متعلق یہ قیاس زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل عبدالملک کے اس استفسار کا تفصیلی جواب ہے جس میں انہوں نے حسن بصری سے قدر کے متعلق ان کی رائے معلوم کی تھی۔(۱۱۲۔۱۱۵ و ۱۶۸)

اس سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر ان کے صاحبزادے کے بقول ایک کے سوا ان کے تمام رسائل جلا دیئے گئے تھے تو ان رسائل کی نسبت ان کی طرف کیسے صحیح ہو سکتی ہے لیکن یہ ممکن ہے یہ رسائل کسی طرح اس وقت ضائع ہونے سے بچ گئے ہوں اور بعد میں دستیاب ہوئے ہوں۔ ان کے قبول عام اور مرجعیت کے پیش نظر یہ بات قرین قیاس ہے کہ ان رسائل کی نقلیں ان کی زندگی ہی میں پھیل گئی ہوں اور اس طرح ان کی حفاظت کی صورت پیدا ہو گئی ہو۔

حسن بصری کی تفسیری خدمات: عہد رسول میں تفسیر قرآن کا سلسلہ اس طرح شروع ہو چکا تھا کہ مشکل قرآنی مقامات کی تفسیر خود زبان رسالت نے کر دی تھی۔ عہد صحابہ میں تفسیر قرآن کا سلسلہ مزید وسیع ہوا اور صحابہ کرام نے تفسیر قرآن کا جو طریقہ اور نہج اختیار کیا اس میں قرآن کی تفسیر قرآن سے ، قرآن کی تفسیر حدیث سے اور قرآن کی تفسیر اجتہاد اور رائے سے جیسے مناہج شامل ہیں۔ لیکن اس دور میں بھی پورے قرآن کی تفسیر کا طریقہ ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ عہد تابعین میں بھی تفسیر کا طریقہ کار تقریباً یہی رہا اور اس میں کوئی بڑی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ البتہ مذکورہ بالا مصادر کے ساتھ ساتھ بعض نئے مصادر مثلاً آثار صحابہ اور اہل

کتاب کی مرویات کا اضافہ کر لیا گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دور تابعین میں اجتہاد اور رائے کا استعمال قرآن و سنت کے عین مطابق ہوتا تھا اور اس سلسلہ میں قرآن و سنت کے متعین کردہ حدود سے سرمو تجاوز ممکن نہ تھا۔

عہد صحابہ میں تفسیر کے کئی مکتب فکر پروان چڑھے، چنانچہ مکہ میں حضرت ابن عباسؓ، مدینہ میں ابی بن کعب اور بصرہ میں عبداللہ بن مسعود کے مکاتب فکر پروان چڑھے جو تفسیر کے مکاتب فکر میں زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر مدرسہ اہل الرائے کے مکتب فکر کے طور پر جانا گیا۔

اس تناظر میں فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ حضرت حسن بصری کس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ پوری صورتحال کو سامنے رکھا جائے تو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً وہ اہل رائے کے مکتب فکر سے زیادہ متاثر رہے ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام اس مکتب فکر کے مرکز بصرہ میں گزارے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ وہ اسی مکتب فکر کے اہم نمائندے تھے۔ (۳) لیکن حقیقت واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ جب ہم ان کی تفسیری مرویات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اہل رائے کی بہ نسبت اہل اثر کے مکتب فکر سے زیادہ متاثر تھے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس سے مروی ان کے تفسیری اقوال حضرت ابن مسعود سے مروی تفسیری اقوال کے مقابلہ میں نو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ کتب تفسیر جیسے **تفسیر طبری، زاد المسیر، تفسیر ابن کثیر، تفسیر سیوطی** میں ان کے بکھرے ہوئے بے شمار تفسیری اقوال اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ وہ اہل اثر کے مکتب فکر کے نمائندہ تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بصرہ میں طویل قیام کے باوجود مکہ و مدینہ کے اسفار میں وہ وہاں کے علماء سے کسب فیض کرتے رہے تھے۔ مزید یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کچھ دنوں بصرہ کے گورنر رہے جہاں انہوں نے ان سے علم تفسیر حاصل کیا اور ان کے مکتب فکر سے اتنے متاثر ہوئے کہ ابن مسعود کے مکتب فکر کے اثرات ان کے سامنے ماند پڑ گئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اہل رائے کے مکتب فکر سے استفادہ ہی نہیں کیا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس انداز تفسیر کے نمونے ان کے یہاں زیادہ نہیں ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ حسن بصری کی تفسیر مکمل کتابی

شکل میں منضبط نہیں ہوسکی کیونکہ اس زمانے تک تصنیفی مذاق عام نہیں ہوا تھا۔ صحابہ کرام یا تابعین کرام کی جانب جو تفاسیر منسوب کی جاتی ہیں ان سے دراصل مراد ان کے وہ تفسیری اقوال ہوتے ہیں جو تفسیری لٹریچر میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ حسن بصری کے انہیں منتشر شہ پاروں کو احمد اسماعیل بسیط نے بڑی عرق ریزی سے ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کی روشنی میں بڑے محققانہ انداز میں ان کی تفسیری خدمات کا جائزہ لیا ہے، جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تفسیری ذوق بہت لطیف تھا اور انہیں آیات کی توضیح وتفسیر کا خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ اس کتاب میں ان کے تفسیری نہج اور اس کی خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ و تجزیہ کیا گیا ہے لیکن فاضل محقق نے اپنی اس کتاب میں حسن بصری کے تمام تفسیری اقوال کو نقل کرنے کے بجائے ان کے چیدہ اور منتخب اقوال کو بیان کرنے پر ہی اکتفا کی ہے اور اسکی وضاحت جابجا کردی ہے (ص ۲۰۲۔۲۰۴، ۲۱۴، ۲۴۸، ۲۸۷) ساتھ ہی ساتھ اس شبہ کا بھی اظہار کیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ تفسیر میں حسن کی مرویات کا کچھ حصہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا ہے۔ (ص ۱۷۲)

حسن بصری کا طریق تفسیر اس عہد کے دیگر مفسرین جیسا ہی ہے، عصر اول میں تفسیر کی تدوین کا کام نہیں ہوا تھا بلکہ تابعین میں جو مفسرین پیدا ہوئے وہ زیادہ تر صحابہ کرام سے سماع، روایت اور ان کے حفظ کا اہتمام کرتے تھے، ان اقوال کو ضبط تحریر میں لانے کی مثالیں بہت ہی کم دستیاب ہوتی ہیں جیسے ابن مجاہد کے متعلق یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ ابن عباس کے اقوال لکھ لیا کرتے تھے۔ (ص ۱۶۷) کم وبیش یہی صورتحال ہم عصر تابعین میں بھی باقی رہی۔ وہ حلقہ درس میں تفسیری اقوال بیان کرتے جو سینہ در سینہ منتقل ہوتے رہتے بقول حمید "میں نے حسن بصری سے قرآن پڑھا، وہ اثباتی انداز میں اس کی تفسیر کردیتے تھے" طبری اور ابن کثیر وغیرہ نے تفسیر کے سلسلہ میں اقوال بیان کئے ہیں جن کی روایت ان کے تلامذہ نے سماعی طور پر کی تھی اور انہوں نے حسن بصری کی کتاب میں یہ اقوال پڑھے تھے، ثعلبی نے بھی الکشف و البیان میں اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ اور تاریخ طبری میں بھی ہمیں حسن بصری سے منقول کچھ تفسیری روایات نظر آتی ہیں۔ (ص ۱۶۸۔۱۶۹)

حضرت حسن بصری کے تفسیری منہج کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تفسیر میں وعظ و ارشاد کا رنگ پیدا کردیتے تھے اور پھر اسی مناسبت سے زیر بحث واقعات وموضوعات کا تفصیل

سے ذکر کرتے تھے۔ تفسیر کے دوران آیات کریمہ پر مختصر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ قصہ اور واقعہ کی تحلیل و تجزیہ نیز اس پر تعلیق و تبصرے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔اس طرح انکی تفسیر سے بہت سے شبہات دور ہوتے ہیں جیسے کذلك نجزی من اسرف (سورہ طہ: ۱۲۵) کے سلسلہ میں اہل علم کو شبہ تھا کہ کہیں یہ آیت توحید پرستوں کے بارے میں نہ ہو لیکن انہوں نے من اسرف سے شرک کرنے والے مراد لیکر اس اندیشہ کو دور کر دیا۔(ص۱۸۱)

تفسیر میں ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ تلامذہ ان کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے۔وہ خود یا ان کا کوئی شاگرد ایک آیت تلاوت کرتا اور وہ خود اس کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ مفردات قرآن کی تشریح کرتے تھے۔اس کی تائید حماد بن سلمہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ حمید سے روایت کرتے ہیں کہ میں حسن بصری کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتا اور حسن بصری اس کی تفسیر بیان کرتے تھے۔دوسری جگہ بیان فرماتے ہیں میں نے حسن سے قرآن پڑھا وہ اثباتی انداز میں اس کی تفسیر کر دیتے تھے۔(ص۱۶۸۔۱۷۷) بقول قرطبی وہ ایک آیت کی تلاوت کے بعد اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک سامعین کو نہ پڑھا دیتے، شان نزول نہ بیان کر دیتے نیز آیت کی مراد پر روشنی نہ ڈال دیتے۔تقریباً یہی طرز انہوں نے تفسیر کا علم حاصل کرتے ہوئے اپنے عہد تعلیم و تربیت میں اختیار کیا تھا۔احمد اسماعیل بسیط نے ذہبی مصنف التفسیر و المفسرون کے حوالہ سے لکھا ہے "انہیں جاننے والوں کا بیان تھا کہ وہ ایک سورت کی قرأت ختم کر کے دوسری سورت کی طرف اس وقت تک نہیں جاتے تھے جب تک وہ اس کی تاویل اور اسکے نزول کے سبب کی واقفیت حاصل نہ کر لیتے" (ص۱۷۱) اسی فارمولہ پر انہوں نے اپنے عہد درس و تدریس میں عمل کیا کیونکہ ان کی نظر میں یہ طریقہ زیادہ کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

ان کے تفسیری اقوال کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ وہ بسا اوقات کسی آیت کے متعلق علماء کے استفسار کا بھی جواب دیتے تھے، اسی طرح عوام الناس کی جانب سے پوچھے گئے کسی آیت کے حکم کے متعلق شافی جواب دیتے تھے گویا ان کی تفسیر میں فقہی مسائل بھی زیر بحث آتے تھے، فقہی احکام سے متعلق آیات کی تفسیر کے دوران اگر انہیں کوئی ماثور حکم نہ ملتا تو وہ اپنی خداداد فقہی حس سے کام لیتے ہوئے ان آیات کے احکام بیان کرتے تھے جس کی وجہ سے بھی بعض لوگوں نے انہیں اصحاب الرائے میں شامل کیا ہے۔(۲۴۳)

حسن بصری کے تفسیر کے اثرات بہت گہرے مرتب ہوئے ہیں، علماء تابعین ان کے تفسیری اقوال کو دوسروں تک منتقل کرنے کا اہتمام کرتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے گراں قدر اقوال سے مستفید ہوسکیں جن کا سماع انہوں نے صحابہ کرام سے کیا تھا اس طرح انکی تفسیر کے سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر محفوظ ہونے کی سبیل پیدا ہو گئی۔ اسی کے ساتھ ان کے تفسیری سرمایہ کو تحریری طور پر محفوظ کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا، چنانچہ دوسری صدی کے ایک عالم ہارون حجازی نے وجوہ آیات سے متعلق ان کے تفسیری اقوال کو اپنی کتاب "الوجوہ و النظائر القرآنیہ" میں جمع کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب اب تک شائع نہ ہوسکی۔ احمد اسماعیل بسیط نے بھی اس کتاب کے مخطوطہ سے کچھ تفسیری مرویات نقل کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بصرہ کی علمی زندگی خاص طور سے تفسیر اور علوم القرآن پر ان کا اثر بہت زیادہ تھا۔ (ص ۱۸۱۔ ۱۸۳)

حسن بصری کے تفسیری اقوال کی متعدد اسانید سے مروی ہیں، فاضل مصنف کی تحقیق کے مطابق ان میں سے بارہ طرق صحیح اور بھروسے کے قابل ہیں اور سات ضعیف اور ناقابل اعتماد ہیں۔ (ص ۱۸۴۔ ۱۹۳)

حسن بصری کا تفسیری مکتب فکر:۔ تفسیر کے اندر وہ تفسیر بالماثور کے مکتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں، تاہم کہیں کہیں انہوں نے تفسیر بالرائے سے بھی کام لیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ بصرہ کا مکتب تفسیر تفسیر بالرائے کے لئے شہرت رکھتا ہے اور بصری ہونے کے ناطے خیال یہی ہوتا ہے کہ انہیں بھی اس مکتب فکر سے وابستہ ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے اور اس کے اسباب پر گذشتہ صفحات میں کسی قدر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

چونکہ وہ تفسیر بالماثور کے مکتب فکر کے نمائندہ ہیں لہذا ان کے تفسیری اقوال میں تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر القرآن بالاحادیث اور تفسیر القرآن بالآثار کے اثرات بہت واضح ہیں، گوکہ ان کے تفسیری سرمایہ میں تفسیر القرآن بالقرآن کے نمونے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ مصنف نے اس کی چار مثالیں نقل کی ہیں۔ (ص ۲۰۲۔ ۲۰۴) البتہ تفسیر القرآن بالحدیث کی کافی مثالیں دستیاب ہیں۔ مصنف نے نمونے کے طور پر بیس روایات نقل کی ہیں۔ (۲۰۴۔ ۲۱۴) ان کی تفسیر کا بیشتر حصہ اقوال صحابہ یعنی تفسیر بالآثار پر مشتمل ہے ایسی مثالوں کی کافی تعداد مصنف نے نقل کی ہے، انہوں نے اپنی تفسیر میں جن صحابہ کے اقوال سے استفادہ کیا ہے ان میں حضرت ابن عباسؓ،

حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ مذکورہ اصحاب میں سب سے زیادہ تفسیری اقوال حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے منقول ہیں ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۵۸ ہے البتہ تفسیر بالرائے کے متعلق مصنف نے ان کے صرف چار مشہور اقوال نقل کرنے کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ایسے اقوال کی تعداد بہت تھوڑی ہے، ان اقوال کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تفسیر بالرائے میں انکی تفسیر کا استناد محمود و مقبول رائے کی طرف ہے جسے علماء نے جائز قرار دیا ہے۔

حسن بصری کے عہد میں فقہ کی تدوین شروع ہو چکی تھی اور حالات و ظروف کے بدلنے کی وجہ سے مسلم معاشرہ کو نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے تفسیری اقوال میں فقہی مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں پیش نظر کتاب میں مصنف نے ایسی ۲۳ آیات نقل کی ہیں جس میں انہوں نے فقہی احکام سے بحث کی ہے۔

اسی طرح وہ عہد مختلف فرق کے نشو نما اور ارتقاء کا عہد ہے، یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی صاحب شعور عالم اپنے آس پاس پھلنے پھولنے والی ان تحریکات سے بے خبر رہتا اور ان کے بارے میں کسی ردعمل کا اظہار نہ کرتا چنانچہ حسن بصری نے بھی ان تحریکات کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا جس کا عکس ان کے تفسیری اقوال میں پایا جاتا ہے۔ اس طرح کے کچھ تفسیری نمونے مولف نے ذکر کئے ہیں۔ (ص ۲۷۳۔۲۷۴)

مذکورہ تمام مباحث حسن بصری سے منقول تفسیری مرویات سے سامنے آتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس عہد میں ابھرنے والے تمام مسائل پر کسی نہ کسی حد تک اپنی تفسیر میں روشنی ڈالی ہے، جس سے اس عہد کے موجودہ تفسیری لٹریچر میں ان کی تفسیر کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ احمد اسماعیل بسیط کا یہ نتیجہ نکالنا بالکل درست اور صحیح ہے کہ ان کی تفسیر عوام الناس سے مربوط تھی، حسن بصری کی مجلس دراصل علمائے اسلام کے تبادلہ خیالات و مذاکرات کی مجلس ہوتی تھی اس طرح گویا یہ ایک علمی مجلس تھی جس میں تفسیر اور فقہ کے مسائل زیر بحث آتے اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور اس طرح حسن بصری قرآن پر تدبر اور اسکی تفسیر کے راستے علم کے اندر ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ (ص ۱۷۷)

تفسیر حسن بصری کے اثرات: علم تفسیر پر حسن بصری کی تفسیر کے گہرے اثرات مرتب

ہوئے ہیں اور اس نے اس علم کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بعد میں آنے والے تابعین اور دیگر مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں حسن بصری کی مرویات نقل کی ہیں۔ متاخرین میں علامہ طبری، ابن الجوزی، ابن کثیر، علامہ سیوطی اور علامہ شوکانی نے انکے اقوال اپنی تفسیر میں جابجا نقل کئے ہیں، خصوصاً علامہ طبری ان کے اقوال زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں۔ تفسیر کے علاوہ علوم قرآن کے دوسرے شعبوں میں بھی حسن بصری کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں اور علماء کی ایک بڑی تعداد ان سے متاثر ہوئی ہے۔

حسن بصری اور علم نسخ: علوم قرآن میں علم ناسخ و منسوخ آیات بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ علماء تفسیر میں اس سلسلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں ایک آیات کے منسوخ ہونے کا قائل ہے تو دوسرا گروہ اس سے انکار کرتا ہے۔ حسن بصری اول الذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور نسخ آیات کے قائل ہیں اور انہوں نے اس کی مشروعیت پر مانننسخ آیۃ سے استدلال کیا ہے۔ ان کے نزدیک نسخ بمعنی نقل اور تغیر و تبدل کے ہے۔ لیکن وہ صرف آیات احکام کے اندر نسخ کے قائل ہیں لہذا وہ آیات اخبار میں نسخ کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن بقول مصنف جن احکام کے بارے میں حسن بصری کی رائے ہے کہ ان کے اندر ناسخ او منسوخ ہے ان میں سے بعض تو متفق علیہ ہیں اور بعض نقد و نظر کی زد میں ہیں۔ مصنف نے دونوں قسموں کی ایک ایک آیت بطور نمونہ نقل کی ہے۔ (ص ۲۷۸۔۲۷۹)

نسخ کے قائل علماء اس کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں (۱) جس کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہو لیکن حکم باقی ہو۔ (۲) جس کا حکم منسوخ ہو چکا ہو لیکن تلاوت باقی ہو۔ (۳) جس کی تلاوت و حکم دونوں منسوخ ہو چکے ہوں۔ حسن بصری کے تفسیری اقوال میں صرف اول الذکر دونوں قسموں کی مثالیں دستیاب ہیں جبکہ موخر الذکر قسم کی کوئی مثال ان کی تفسیر میں دستیاب نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے نسخ کیلئے جو قاعدہ وضع کیا ہے وہ اس نوع کے نسخ کی بھی اجازت دیتا ہے۔ (ص ۲۸۴)

امام حسن بصری اور علم قرأت: مفسرین کے لئے تفسیر قرآن کے لئے علم قرأت سے واقفیت حاصل کرنا ضروری و لازم ہے بلکہ بعض ائمہ نے تفسیر قرآن کے لئے اسے شرط قرار دیا ہے، عہد تابعین میں چونکہ علم کی درجہ بندی مکمل طور پر نہ ہو سکی تھی لہٰذا عہد تابعین میں علماء و فضلاء کو تقریباً اس وقت کے مروجہ سارے علوم پر درک حاصل ہوتا تھا جس سے وہ مختلف مقامات

پر استفادہ کرتے تھے۔ امام حسن بصری کو بھی علم قرأت میں درک حاصل تھا لیکن ان کے اقوال قرأت کے جائزہ سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ ان میں سے بعض اقوال علماء قرأت کی بیان کردہ بعض شرائط پر پورے نہیں اترتے ہیں جسکی وجہ سے علماء نے ان کے اقوال کو شاذ قرار دیا ہے البتہ ان سے مروی غالب اقوال قرأت، شرائط قرأت سے موافقت رکھتے ہیں لہٰذا وہ معتبر ومقبول ہیں، مصنف نے ان کے اقوال قرأت سے متعلق ۱۴ آیات نقل کی ہیں۔ (ص ۲۸۷۔۲۹۲)

امام حسن بصری اور علم اسباب نزول: علوم قرآن میں علم اسباب نزول کافی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تفسیر قرآن اور فہم قرآن میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ عہد تابعین میں علوم کی درجہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے اس عہد کے مفسرین ان تمام علوم سے واقف ہوتے تھے جن کی ضرورت قرآن کی تفسیر کے دوران پیش آتی تھی۔ امام حسن بصری بھی اس علم میں کافی مہارت رکھتے تھے اور انہوں نے اس علم کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا جیسا کہ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سورت کی قرأت ختم کر کے دوسری سورت کی طرف اس وقت تک نہیں جاتے تھے جب تک وہ اس کی تاویل اور اس کے نزول کے سبب سے واقفیت حاصل نہ کرلیتے تھے۔ اسی طرح وہ اپنے عہد درس و تدریس میں آیت کے اسباب نزول پر مکمل بحث کرتے تھے تاکہ لوگوں کو اسباب نزول کا علم ہو جائے جس کے بغیر قرآن پر مکمل عبور حاصل کرنا مشکل ہے ان کے اس طریقہ کار کی تائید قرطبی کے قول سے ہوتی ہے کہ وہ ایک آیت کی تلاوت کے بعد اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک سامعین کو پڑھا نہ دیتے اور شان نزول بیان نہ کر دیتے، نیز آیت کی مراد پر روشنی نہ ڈال لیتے۔ (ص ۱۷۷)

امام حسن بصری صرف اسباب نزول کے بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اسباب نزول کے ذکر کے دوران آیت کے معانی بیان کرنے کا بھی اہتمام کرتے ہیں، بسا اوقات وہ اسباب نزول کو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں تاکہ آیت کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے، لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس شان نزول کو اجمالاً بیان کر کے گزر جاتے ہیں، کبھی کبھی وہ ایسا سبب نزول ذکر کرتے ہیں جو اس کا حقیقی سبب نزول نہیں ہوتا ہے بلکہ حقیقی سبب نزول کی طرف اس سے اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ (ص ۳۰۱)

اسباب نزول ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ زمانہ نزول کو بیان کرنے کا بھی اہتمام کرتے

ہیں کہ فلاں سورت کب اور کہاں نازل ہوئی، مزید برآں اس کے ساتھ ساتھ (ص ۱۶) دیگر تفصیلات کا بھی ذکر کرتے ہیں جیسے سورہ بقرہ کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے کہ مدینہ میں نازل ہونے والی پہلی سورت ہے۔

اس مختصر گفتگو سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت حسن بصری نے تفسیر کے میدان میں ایک غیر معمولی اور بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ تفسیر بالرائے کے مرکز بصرہ میں رہنے کے باوجود وہ بنیادی طور پر تفسیر بالاثر کے اصول پر عمل پیرا رہے لیکن جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی وہاں تفسیر بالرائے کا بھی سہارا لیا، چنانچہ اس سلسلہ میں یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ کلی طور پر کسی ایک مسلک پر انحصار کرنے کے بجائے وہ اس میدان میں وسعت کے قائل تھے اور ان تمام ممکنہ وسائل کو استعمال کرتے تھے جن سے کتاب اللہ کی تفسیر و توضیح میں مدد مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نہج تفسیر نے خود ان کی اپنی زندگی ہی میں ایک مستقل مکتب فکر کی حیثیت حاصل کرلی تھی اور بعد کے ادوار میں مفسرین پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ ان اسباب کی بناء پر بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل وتعمیر کی تاریخ میں حضرت حسن بصری کی شخصیت کو ایک منفرد مقام حاصل ہے، بہت سے اسلامی علوم وفنون اور فکری درباروں پر ان کے افکار وخیالات کی واضح چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کی شخصیت کی اہمیت کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ نہ صرف ان کے زمانے میں ظہور پذیر ہونے والی فکری تحریکات بلکہ انکے بہت بعد وجود میں آنے والی تحریکات ان سے انتساب میں فخر محسوس کرتی ہیں اور انہیں اپنا فکری موسس گردانتی ہیں۔ حالانکہ یہ بات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ وہ صرف اور صرف اہل سنت وجماعت کے مکتب فکر کے نمائندہ اور ترجمان تھے۔

حواشی

(۱) غلام احمد حریری، تاریخ تفسیر و مفسرین، تاج کمپنی (ب۔ت) صفحہ ۱۳۸ بحوالہ وفیات الاعیان تحقیق محمد عبدالحمید (۳/ ۱۳۲)

(۲) شاید کتابت کی غلطی سے قرۃ بن خالد کا دوسری جگہ مرۃ بن خالد ہو گیا ہے۔ ورنہ دراصل دونوں شخصیتیں ایک ہی ہیں۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ تفسیر ومفسرین از غلام حریری صفحہ ۱۱۴/۱۲۱، انھوں نے اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی ان کا ذکر مدرسہ عراق کے مفسرین میں کیا ہے۔

شیخ محمد عبدہ کی تفسیری خدمات

صفدر سلطان اصلاحی

شیخ محمد عبدہ ۱۲۶۵ھ۔۱۸۴۹ء میں مصر میں ضلع "البحیرۃ" کے ایک گاؤں "محلہ نصر" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدہ بن حسن خیر اللہ گاؤں کے انتہائی باوقار اور بااثر لوگوں میں سے تھے۔ ہمدردی و غمگساری، جود و سخا اور خدمت خلق میں ان کا ایک منفرد مقام تھا۔ وہ حق کی حمایت، عہد کی پاسداری اور مخالفتوں کے بالمقابل صبر و ثبات کی صفات سے بھی متصف تھے۔ ان کی والدہ "سیدہ جنینہ" بھی ایک نیک اور ذی حیثیت خاتون تھیں۔ فقیروں اور محتاجوں کی حمایت اور پریشان حال لوگوں کی مشکلات کا ازالہ ان کا امتیازی وصف تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے والدین کی مذکورہ خوبیاں وراثت میں پائی تھیں (۱)

ان کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام گاؤں کے مکتب کے بجائے گھر پر ہوا۔ والد صاحب نے ان کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انہیں گاؤں کے مکتب میں بھیج دیا گیا جہاں ایک حافظ سے انہوں نے قرآن پڑھا پھر دو سال میں اسے حفظ کیا (۲)۔ ۱۲۷۹ھ۔۱۸۶۲ء میں قرآن پاک کی تجوید اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے وہ شہر طنطا کی مسجد "جامع احمدی" میں قائم مدرسہ میں داخل ہوئے۔ قرآن مجید کی تجوید اور اس کے اصول و آداب سے انہوں نے جلد ہی واقفیت حاصل کرلی۔ بعض دوسرے علوم خاص طور سے نحو و صرف اور فقہ کی تعلیم ان کے لئے مشکل ثابت ہوئی کیونکہ اساتذہ قدیم طرز تدریس کے عادی تھے اور فقہی و نحوی مسائل کو اپنے مخصوص طریقۂ تعلیم کی وجہ سے اور زیادہ پیچیدہ بنادیتے تھے۔ نتیجۃً ڈیڑھ سال کے ناکام تجربہ کے بعد وہ جامع احمدی سے دل برداشتہ ہو کر گھر واپس چلے گئے اور کھیتی باڑی کے کاموں میں حصہ لینے لگے۔ تعلیم سے بے رغبتی اور عدم دلچسپی کو دیکھ کر ان کے والدین نے ۱۲۸۲ھ۔۱۸۶۵ء میں ان کی شادی کردی۔ (۳)